ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 417

Program: B.A. / Associate Degree

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ISLAMABAD ,ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: مطالعہ پاکستان (417) • سطح: بی اے / ایسوسی ایٹ ڈگری

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (کُل نمبر: 100)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(Reference &For Study)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کو غور سے پڑھیں، مواد کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں لکھیں، کیونکہ نقل شدہ مواد پر یونیورسٹی کی مواد کی چوری (Plagiarism) پالیسی کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 1: 1935 کے ایکٹ اور طرزِ حکومت پر قائداعظم کے خیالات (20 نمبر)

سوال نمبر 1: 1935 کے ایکٹ اور طرزِ حکومت پر قائداعظم کے خیالات پر تفصیلاً بحث کریں۔ (20)

تعارف

حکومتِ ہند ایکٹ 1935 برصغیر کی آئینی تاریخ کا سب سے طویل اور سب سے اہم دستاویز تھا، جس نے آزادی کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں کے ابتدائی آئینی ڈھانچے کی بنیاد فراہم کی۔ یہ ایکٹ گول میز کانفرنسوں (1930 تا 1932)، 1933 کے وائٹ پیپر اور پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی سفارشات کے طویل عمل کے بعد برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہوا۔ اس ایکٹ کے ذریعے برطانوی حکومت نے پہلی مرتبہ برصغیر میں ایک وفاقی ڈھانچے اور صوبائی خود مختاری کا وعدہ کیا، لیکن اس کے ساتھ محافظانہ

تحفظات(safeguards) اور گورنر جنرل اور گورنروں کے وسیع اختیارات نے اس وعدے کو مشکوک بھی بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ اس ایکٹ پر ہر بڑی سیاسی جماعت نے سخت بحث کی اور قائداعظم محمد علی جناح کی رائے اس سلسلے میں سب سے زیادہ متوازن اور دور رس سمجھی جاتی ہے۔

قائداعظم کی سیاسی زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت ان کا آئینی طرزِ فکر تھا۔ وہ انقلاب یا تشدد کے بجائے آئینی اور قانونی طریقہ کار پر یقین رکھتے تھے، اسی لیے جب کوئی آئینی تجویز سامنے آتی تو وہ اس کا مطالعہ ایک ماہر قانون دان کی نظر سے کرتے تھے کے مضمرات جانچتے اور پھر دوٹوک مگر مدلل رائے دیتے۔ 1935 کے ایکٹ کے بارے میں بھی ان کا ردِ عمل جذباتی نفی یا اندھی قبولیت نہیں تھا بلکہ ایک ٹھنڈے تجزیے پر مبنی تھا: انہوں نے ایکٹ کے وفاقی حصے کو سختی سے مسترد کیا، صوبائی حصے کو خامیوں کے باوجود قابلِ عمل قرار دیا اور ساتھ ہی یہ واضح کیا کہ ہندوستان کے لیے موزوں طرزِ حکومت وفاقی، پارلیمانی اور جمہوری ہونا چاہیے جس میں اقلیتوں کے حقوق کی مؤثر ضمانت موجود ہو۔ اس جواب میں پہلے ایکٹ کی اہم خصوصیات بیان کی جائیں گی، پھر قائداعظم کی تنقید اور ان کے مطلوبہ طرزِ حکومت پر تفصیلی بحث ہو گی۔

ایکٹ 1935 کی اہم خصوصیات

اس ایکٹ کے تحت پہلی مرتبہ برصغیر کے لیے آل انڈیا فیڈریشن کی تجویز پیش کی گئی جس میں برطانوی ہند کے صوبے اور ریاستوں (princely states) کو شامل ہونا تھا، لیکن ریاستوں کے الحاق کو ان کے حکمرانوں کی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا، اس لیے وفاق کبھی قائم نہ ہو سکا۔ مرکز میں دوایوانی مقننہ تجویز ہوئی جبکہ دفاع، خارجہ امور اور مذہبی امور جیسے اہم شعبے گورنر جنرل کے لیے مخصوص (reserved) رکھے گئے اور بقیہ منتقل شدہ (transferred) شعبے وزرا کے سپرد کیے گئے؛ اس طرح مرکز میں ایک نئی قسم کی دو عملی (dyarchy) قائم کر دی گئی، حالانکہ صوبوں میں 1919 کی دو عملی ختم کر دی گئی تھی۔

صوبائی سطح پر صوبائی خود مختاری اس ایکٹ کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی: منتخب اسمبلی کے سامنے جواب دہ وزرا کی کونسل بنائی گئی اور گورنر کو عام حالات میں وزرا کے مشورے پر چلنا تھا۔ تاہم گورنر کو خصوصی ذمہ داریوں، صوابدیدی اختیارات اور آرڈیننس جاری کرنے کے وسیع حقوق بھی دیے گئے۔ ایکٹ نے حقِ رائے دہی کو وسعت دی اور تقریباً چودہ فیصد آبادی کو ووٹ کا حق ملا، فیڈرل کورٹ اور ریزرو بینک آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا، سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنایا گیا اور برما کو ہندوستان سے جدا کر دیا گیا۔

موضوعات کو وفاقی، صوبائی اور مشترکہ تین فہرستوں میں تقسیم کیا گیا، مگر بقیہ (residuary) اختیارات صوبوں یا مرکز کے بجائے گورنر جنرل کو دیے گئے، جو وفاقی اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔

جدول 1: ایکٹ 1935 کی اہم خصوصیات اور قائداعظم کا ردِ عمل

خصوصیت	تفصیل	قائداعظم کا ردِ عمل
آل انڈیا فیڈریشن	صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل وفاق؛ ریاستوں کا الحاق رضا کارانہ	سخت تنقید؛ غیر جمہوری اور ناقابلِ قبول قرار دیا
مرکز میں دوعملی	دفاع اور خارجہ امور گورنر جنرل کے پاس مخصوص، بقیہ منتقل شدہ	ذمہ دار حکومت کے منافی قرار دیا
صوبائی خود مختاری	منتخب اسمبلی کے سامنے جواب دہ وزرا؛ دوعملی ختم	تحفظات کے ساتھ انتخابات میں شرکت کی حکمتِ عملی
بقیہ اختیارات	مرکز یا صوبوں کے بجائے گورنر جنرل کو دیے گئے	خامہ ظاہر کیا؛ بقیہ اختیارات صوبوں کا حق قرار دیے
تحفظات و خصوصی اختیارات	گورنر اور گورنر جنرل کے صوابدیدی اور ہنگامی اختیارات	جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیا

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

وفاقی اسکیم پر قائداعظم کی تنقید

قائداعظم نے ایکٹ کے وفاقی حصے پر شدید تنقید کی اور اسے مشہور الفاظ میں مکمل طور پر سڑا ہوا، بنیادی طور پر خراب اور ناقابلِ قبول قرار دیا۔ ان کی تنقید کی بنیادیں واضح تھیں۔ اول یہ کہ مجوزہ وفاق میں ریاستیں اپنے نمائندے عوام کے ووٹ سے نہیں بلکہ حکمرانوں کی نامزدگی سے بھیجتیں، یعنی ایک غیر جمہوری عنصر وفاق کے مرکز میں مستقل طور پر بیٹھ جاتا اور جمہوری پیش رفت کو روکنے کا کام دیتا۔ دوم یہ کہ مخصوص شعبوں اور تحفظات کے ذریعے اصل اقتدار گورنر جنرل اور برطانوی پارلیمنٹ کے پاس رہتا اور منتخب نمائندے محض نمائشی حیثیت رکھتے، لہٰذا ذمہ دار حکومت کا وعدہ محض دھوکا ثابت ہوتا۔

سوم یہ کہ بقیہ اختیارات گورنر جنرل کو دینے سے صوبے کمزور اور مرکز بے جا طاقت ور بنتا، حالانکہ قائداعظم کے نزدیک ہندوستان جیسے وسیع اور متنوع ملک میں اصل ضرورت صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کی تھی۔ چہارم، ان کے خیال میں یہ اسکیم اس انداز سے تیار کی گئی تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبے بھی کسی فیصلہ

کن پوزیشن میں نہ آسکیں اور بالآخر سیاسی بھاری پن اسی اکثریتی قیادت کے پاس رہے جس سے اقلیتوں کے خدشات بڑھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ نے 1936 میں وفاقی حصے کو باقاعدہ مسترد کر دیا اور اس کے خلاف ملک گیر مہم چلائی، جبکہ وفاق کا یہ حصہ ریاستوں کے عدم تعاون کی وجہ سے عملاً کبھی نافذ ہی نہ ہو سکا، جس سے قائداعظم کے تجزیے کی صداقت مزید ثابت ہوئی۔

صوبائی حصے کے بارے میں قائداعظم کا مؤقف

وفاق کی اس شدید مخالفت کے باوجود قائداعظم نے صوبائی خود مختاری والے حصے کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ اپنایا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ صوبائی اسکیم بھی گورنر کے خصوصی اختیارات کی وجہ سے نامکمل ہے، تاہم یہ 1919 کے نظام سے بہرحال آگے کا قدم ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اسے نظر انداز کرنے کے بجائے انتخابات میں بھرپور حصہ لے کر اس سے اپنا حق حاصل کرنا چاہیے۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت مسلم لیگ نے 1937 کے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا۔ یہ رویہ قائداعظم کی آئینی تدبر پسندی کو ظاہر کرتا ہے: وہ مثالی دنیا کا انتظار کرنے کے بجائے موجودہ امکانات کو قوم کے حق میں استعمال کرنے کے قائل تھے۔

ساتھ ہی قائداعظم نے بارہا واضح کیا کہ انتخابات میں شرکت کا مطلب ایکٹ کو اصولی طور پر منظور کرنا نہیں۔ صوبائی حکومتوں کے تجربے نے جلد ہی ان کے خدشات درست ثابت کر دیے، خصوصاً 1937 تا 1939 کی کانگریسی وزارتوں کے دوران جب مسلمانوں کے ساتھ تعلیمی، ثقافتی اور معاشی امتیاز کے واقعات پیش آئے تو قائداعظم کا یہ مؤقف مضبوط ہوا کہ محض ایکٹ کے سائے میں اقلیت کا تحفظ ممکن نہیں؛ اس کے لیے یا تو مؤثر آئینی ضمانتیں درکار ہیں یا پھر مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت کو تسلیم کرنا ہو گا۔ یوں ایکٹ 1935 پر ہونے والی بحث نے راستا تحریک پاکستان کے فکری ارتقا کی طرف کھولا اور قائداعظم کی قیادت میں مسلمان ایک منتشر دباؤ گروپ سے منظم سیاسی قوت بن گئے۔

قائداعظم کا مطلوبہ طرزِ حکومت

ایکٹ پر تنقید کے ساتھ ساتھ قائداعظم نے اپنا متبادل تصور بھی بار بار پیش کیا، جس کی جھلک ان کے چودہ نکات (1929) میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے مطلوبہ طرزِ حکومت کی پہلی بنیاد وفاقی ڈھانچہ تھی جس میں بقیہ اختیارات مرکز کے بجائے صوبوں کے پاس ہوں اور صوبے داخلی معاملات میں خود مختار ہوں، کیونکہ ہندوستان کے

مختلف خطے زبان، ثقافت اور مذہب کے اعتبار سے اس قدر مختلف تھے کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت لامحالہ اکثریت کی حکومت میں ڈھل جاتی۔ دوسری بنیاد پارلیمانی جمہوریت تھی: حکومت منتخب نمائندوں کی ہو، وزرا مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں اور کوئی آمر یا وائسرائے عوامی فیصلے کو ویٹو نہ کر سکے۔

تیسری بنیاد اقلیتوں کے حقوق کی آئینی ضمانت تھی۔ قائداعظم کے چودہ نکات میں مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی، جداگانہ انتخابات کی بقا، سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات، مرکزی کابینہ میں ایک ہندو وزرا اور مذہبی آزادی کی مکمل ضمانت شامل تھیں۔ چوتھی بنیاد قانون کی حکمرانی اور آزاد عدلیہ تھی؛ قائداعظم زندگی بھر یہ کہتے رہے کہ وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کریں گے جو آئین اور قانون سے باہر ہو۔ پانچویں بنیاد یہ تھی کہ طرزِ حکومت کے بارے میں ان کا تصور مذہبی ریاست کا نہیں بلکہ ایک منصفانہ آئینی ریاست کا تھا جہاں تمام شہریوں کو برابر حقوق حاصل ہوں، مذہب ریاست کے بجائے فرد کا ذاتی معاملہ ہو اور اقتدارِ اعلیٰ قانون کے تابع ہو۔ ان کی گیارہ اگست 1947 کی تقریر اسی سوچ کی عکاس ہے جس میں انہوں نے تمام شہریوں کی برابری اور مذہبی آزادی کی یقین دہانی کرائی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قائداعظم نے ایکٹ 1935 کو اس کے اصل مقصد کے آئینے میں پرکھا: یہ ایکٹ ہندوستان کو خود حکومت دینے کے بجائے برطانوی کنٹرول کو نئے روپ میں برقرار رکھنے کی کوشش تھی، اس لیے اس کی وفاقی اسکیم ناقابلِ قبول تھی، جبکہ اس کا صوبائی حصہ محدود دائرے میں قابلِ استعمال تھا۔ مگر قائداعظم کی اصل خدمات محض تنقید نہیں بلکہ وہ واضح متبادل تھیں جو انہوں نے پیش کیا: ایسا وفاقی، پارلیمانی اور جمہوری طرزِ حکومت جس میں صوبے خود مختار ہوں، اقلیتوں کے حقوق آئین میں درج اور محفوظ ہوں اور حکمران قانون کے سامنے جواب دہ ہوں۔ بعد کی تاریخ نے ظاہر کیا کہ یہی تصورات قراردادِ پاکستان اور پھر پاکستان کے آئینی سفر کی فکری بنیاد بنے، اس لیے ایکٹ 1935 پر قائداعظم کی بحث کو محض وقتی سیاست نہیں بلکہ ایک مکمل آئینی فکر کا اظہار سمجھنا چاہیے۔

سوال نمبر 2: 1857 کی جنگِ آزادی کے واقعات اور نتائج (20 نمبر)

سوال نمبر 2: 1857 کی جنگِ آزادی کے واقعات اور نتائج تفصیل سے بیان کریں۔ (20)

تعارف

1857 کی جنگِ آزادی برصغیر کی تاریخ کا وہ عظیم مگر المناک باب ہے جس میں ہندوستانی عوام نے پہلی مرتبہ بڑے پیمانے پر انگریزی راج کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ یہ جنگ اچانک نمودار ہونے والا واقعہ نہیں تھی بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سالہ ظلم، معاشی استحصال، سیاسی قبضے اور مذہبی و سماجی مداخلت کے خلاف جمع شدہ غصے کا لاوا تھی۔ چربی والے کارتوسوں کا مسئلہ صرف چنگاری ثابت ہوا۔ بیرک پور سے اٹھنے والی یہ تحریک چند ہفتوں میں میرٹھ، دہلی، کانپور، لکھنؤ، جھانسی اور بہار تک پھیل گئی اور دہلی کو اس نے اپنا علامتی مرکز بنا لیا، جہاں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو سپہ سالار تسلیم کیا گیا۔ اگرچہ یہ جنگ کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس نے برطانوی راج کی بنیادیں ہلا دیں اور آنے والی آزادی کی تمام تحریکوں کے لیے مشعلِ راہ بنی۔

اس سوال کے دو حصے ہیں: پہلے جنگ کے اہم واقعات مرحلہ وار بیان کیے جائیں گے، پھر اس کے قریبی اور دور رس نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر لڑے، جس کی یاد بعد میں برطانوی پالیسی سازوں کے لیے ہمیشہ تشویش کا باعث رہی۔ یہی وجہ ہے کہ شکست کے بعد سب سے زیادہ انتقام کا نشانہ مسلمانوں اور دہلی شہر کو بنایا گیا۔ جنگ کی ناکامی کے اسباب میں تنظیم، اسلحے اور قیادت کے اتحاد کا فقدان نمایاں تھا، لیکن اس ناکامی کے باوجود 1857 ہندوستانی تاریخ میں غلامی سے نجات کی پہلی عظیم جدوجہد کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

جنگ کا آغاز: بیرک پور اور میرٹھ

جنگ کی فوری وجہ نئے انفیلیڈ رائفل کے کارتوس بنے جنہیں استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا اور سپاہیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ان پر گائے اور خنزیر کی چربی لگی ہے، جس سے ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے۔ 29 مارچ 1857 کو بیرک پور چھاؤنی میں منگل پانڈے نے اس کے خلاف بغاوت کی اور انگریز افسروں پر حملہ کیا؛ انہیں پھانسی دے دی گئی مگر ان کی قربانی نے پورے ملک میں ہلچل مچا دی۔ 10 مئی 1857 کو میرٹھ کے سپاہیوں نے اپنے ان ساتھیوں کو چھڑایا جنہیں کارتوس استعمال سے انکار پر قید کیا گیا تھا، انگریز افسروں کو قتل کیا اور دہلی کی طرف کوچ کر گئے۔

11 مئی کو میرٹھ کے سپاہی دہلی پہنچے، دہلی کی فوج ان سے آملی اور بزرگ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا بادشاہ اور تحریک کا قائد تسلیم کر لیا گیا۔ دہلی کا انقلاب کا مرکز بننا سیاسی لحاظ سے بہت بڑی بات تھی، کیونکہ اس سے بغاوت ایک علامتی جائز حیثیت حاصل کر گئی اور پورے شمالی ہند کے لیے ایک مشترکہ پرچم میسر آ گیا۔ انگریزوں کے لیے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنا وقار کا سوال بن گیا، اس لیے پنجاب سے فوجیں لا کر شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ مہینوں کی خونریز لڑائی کے بعد ستمبر 1857 میں انگریز دہلی پر قابض ہوئے، بہادر شاہ ظفر گرفتار ہو کر رنگون جلاوطن کیے گئے، ان کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا اور شہر میں عام قتل و غارت اور لوٹ مار ہوئی۔

کانپور، لکھنؤ اور دیگر بڑے مراکز

کانپور میں نانا صاحب نے قیادت سنبھالی اور ان کے جری ساتھی تانتیا ٹوپی نے گوریلا جنگ میں غیر معمولی مہارت دکھائی۔ کانپور میں انگریز چھاؤنی کا محاصرہ ہوا، پھر شہر انگریزوں اور آزاد فوجوں کے درمیان کئی بار منتقل ہوا اور بالآخر کیپٹن ہیولاک اور بعد میں کیمپبل کی فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اودھ کا مرکز لکھنؤ تھا جہاں بیگم حضرت محل نے اپنے نابالغ بیٹے برجیس قدر کو تخت پر بٹھا کر جنگ کی قیادت کی؛ لکھنؤ کی ریذیڈنسی کا مشہور محاصرہ مہینوں جاری رہا اور شہر مارچ 1858 میں انگریزوں کے قبضے میں گیا، مگر اودھ کے دیہات میں مزاحمت اس کے بعد بھی جاری رہی، کیونکہ یہاں جاگیرداروں اور کسانوں نے بڑی تعداد میں جنگ میں حصہ لیا تھا۔

جھانسی میں رانی لکشمی بائی نے اپنی ریاست کے الحاق (نظریہ انضمام) کے خلاف لڑتے لڑتے جان دی اور ان کی بہادری آج بھی ضرب المثل ہے؛ وہ گوالیار کے قریب لڑائی میں شہید ہوئیں۔ بہار میں کنور سنگھ جیسے بزرگ سردار نے بڑھاپے کے باوجود انگریزوں کو سخت مقابلہ دیا اور آرا اور جگدیش پور کے علاقے میں آزادی کی فوجوں کی قیادت کی۔ روہیل کھنڈ میں خان بہادر خان، فیض آباد میں مولوی احمد اللہ شاہ اور دوسرے بہت سے مقامی قائدین نے اپنے اپنے علاقوں میں جنگ کا پرچم بلند رکھا۔ یوں یہ تحریک کسی ایک علاقے تک محدود نہیں تھی، تاہم مختلف مراکز کے درمیان رابطے اور مشترکہ حکمتِ عملی کا فقدان اس کی بڑی کمزوری رہا۔

جدول 1: جنگِ آزادی 1857 کے اہم واقعات کی زمانی ترتیب

تاریخ	مقام	اہم واقعہ
29 مارچ 1857	بیرک پور	منگل پانڈے کی بغاوت؛ کارتوسوں کے خلاف پہلی مزاحمت

10 مئی 1857	میرٹھ	سپاہیوں کی بغاوت اور دہلی کی طرف کوچ
11 مئی 1857	دہلی	بہادر شاہ ظفر کو تحریک کا قائد تسلیم کیا گیا
جون تا جولائی 1857	کانپور	ناناصاحب اور تانتیاٹوپی کی قیادت میں لڑائی
ستمبر 1857	دہلی	انگریزوں کا دوبارہ قبضہ؛ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری
مارچ 1858	لکھنؤ	بیگم حضرت محل کی مزاحمت کے بعد شہر کا سقوط
جون 1858	گوالیار	رانی لکشمی بائی کی شہادت

جنگ کے نتائج: سیاسی اور آئینی تبدیلیاں

جنگ کا پہلا اور بنیادی نتیجہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا خاتمہ تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے حکومتِ ہند ایکٹ 1858ء منظور کر کے ہندوستان کی حکومت براہِ راست تاجِ برطانیہ کے سپرد کر دی، گورنر جنرل کو وائسرائے کا لقب ملا اور لندن میں سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کا نیا عہدہ قائم ہوا۔ یکم نومبر 1858ء کو الٰہ آباد دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا اعلان پڑھا گیا جس میں ہندوستانیوں کو مذہبی آزادی، روایات کے احترام، ریاستوں کے مزید انضمام سے دستبرداری اور نوکریوں میں عدم امتیاز کی یقین دہانیاں کرائی گئیں۔ مغلیہ سلطنت کا رسمی خاتمہ بھی اسی جنگ کا نتیجہ تھا؛ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے ساتھ تین صدیوں پر انا مغل دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

فوجی تنظیم بھی بنیادی طور پر بدل دی گئی۔ ہندوستانی سپاہیوں کی نسبت کم کر دی گئی، توپ خانہ تقریباً مکمل طور پر یورپی فوجیوں کے پاس رکھا گیا، بھرتی کا نظام نسلی بنیادوں پر مارشل اور غیر مارشل اقوام کی تقسیم سے جوڑ دیا گیا اور پنجاب کو بھرتی کا بڑا مرکز بنا لیا گیا تاکہ مستقبل میں متحد بغاوت کا امکان ختم ہو جائے۔ انتظامی سطح پر انگریزوں نے راجاؤں اور نوابوں کو اپنا اتحادی بنانے کی پالیسی اختیار کی، کیونکہ جنگ میں جن ریاستوں نے انگریز کا ساتھ دیا تھا انہیں وہ اپنا ستون سمجھنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو بھی دانستہ طور پر مضبوط کیا گیا تاکہ ہندو مسلم اتحاد کی دوبارہ صورت نہ بن سکے۔

سماجی، معاشی اور مسلمانوں پر اثرات

سماجی اور معاشی سطح پر نتائج نہایت تلخ تھے۔ دہلی اور دیگر شہروں میں قتلِ عام، املاک کی ضبطی اور مدارس و کتب خانوں کی تباہی سے علم و ادب کو شدید نقصان پہنچا۔ مسلمانوں کو جنگ کا اصل ذمہ دار سمجھا گیا کیونکہ تحریک کا علامتی مرکز مغل بادشاہ تھا، چنانچہ دہلی میں مسلمانوں کو شہر بدر کیا گیا، ان کی جاگیریں ضبط ہوئیں اور سرکاری نوکریوں کے دروازے ان پر تقریباً بند ہو گئے؛ دہلی کی جامع مسجد اور دیگر [illegible] مقامات عرصے تک فوجی قبضے میں رہے۔ اس امتیازی رویے کے نتیجے میں مسلمان تعلیم اور معاشرے میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے، جس صورتحال کو بدلنے کے لیے بعد میں سر سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔

دوسری طرف اس جنگ نے برطانوی پالیسی کو احتیاط کی طرف دھکیل دیا: مذہبی معاملات میں کھلی مداخلت بظاہر بند ہوئی، سماجی اصلاحات کے پروگرام محتاط ہو گئے اور حکومت نے ہندوستانی رائے کی مکمل بے پروائی ترک کر کے بعد ازاں محدود نمائندگی کے تجربے شروع کیے، جن کا نقطۂ آغاز 1861 کا انڈین کونسلز ایکٹ بنا۔ دور رس اعتبار سے سب سے اہم نتیجہ ذہنی تھا: 1857 نے ثابت کر دیا کہ برطانوی راج ناقابلِ تسخیر نہیں اور آزادی کا جذبہ مر نہیں سکتا۔ بیسویں صدی کے آزادی کے رہنماؤں نے اس جنگ کو اپنی تحریک کی پہلی کڑی قرار دیا، قومی تاریخ نویسی میں اسے جنگِ آزادی کا درجہ ملا اور اس کی یاد نے کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر تحریکوں کی جدوجہد کو اخلاقی توانائی فراہم کی۔

نتیجہ

نتیجتاً کہا جا سکتا ہے کہ 1857 کی جنگِ آزادی بظاہر ناکام ہوئی مگر برصغیر کی تاریخ کا رخ بدل گئی: کمپنی راج ختم ہوا، تاج کا براہِ راست اقتدار شروع ہوا، فوج اور انتظامیہ کی نئی تنظیم ہوئی اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی مستقل رخ اختیار کر گئی۔ مسلمانوں نے اس کی سب سے بھاری قیمت ادا کی، مگر اسی صدمے سے بیداری کی نئی لہریں پیدا ہوئیں، جن میں علی گڑھ تحریک نمایاں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس جنگ نے آزادی کو خواب سے ایک قابلِ حصول سیاسی مقصد بنا دیا۔ جب ہم واقعات کی تفصیل اور نتائج کی وسعت کو ایک ساتھ دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ 1857 محض ایک بغاوت نہیں تھی بلکہ برصغیر کی جدید قومی تاریخ کا سنگِ میل تھی۔

سوال نمبر 3: قراردادِ پاکستان کے بنیادی نکات (20 نمبر)

سوال نمبر 3: قراردادِ پاکستان کے بنیادی نکات کی وضاحت کریں۔ (20)

تعارف

قراردادِ پاکستان، جو بعد میں قراردادِ لاہور کے نام سے بھی مشہور ہوئی، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں 23 مارچ 1940 کو منظور ہوئی۔ اسے بنگال کے وزیرِ اعلیٰ مولوی اے کے فضل الحق نے پیش کیا اور متحدہ صوبے کے چوہدری خلیق الزماں سمیت مختلف صوبوں کے ممتاز رہنماؤں نے اس کی تائید کی۔ یہ قرارداد برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی، کیونکہ اس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنے لیے جداگانہ آزاد ریاستوں کا مطالبہ باقاعدہ اور اجتماعی طور پر پیش کیا۔ اس سے قبل مسلمانوں کا مطالبہ زیادہ تر حقوق کے تحفظ، جداگانہ انتخابات اور آئینی ضمانتوں تک محدود تھا؛ قرارداد کے بعد تحریک کا مقصد واضح ہو گیا اور پھر اس مقصد سے پیچھے ہٹنا قیادت کے لیے بھی ممکن نہ رہا۔

قرارداد کی فکری بنیاد دو قومی نظریہ تھا، جس کی رو سے مسلمان مذہب، تاریخ، ثقافت، رسوم اور تصورِ زندگی کے اعتبار سے ہندوؤں سے الگ قوم تھے اور اکثریتی جمہوریت کے ایسے نظام میں ان کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے جہاں تعداد ہی فیصلے کا واحد پیمانہ ہو۔ قرارداد نہرو رپورٹ کی ناکامی، چودہ نکات کی عدم قبولیت اور خصوصاً 1937 تا 1939 کی کانگریسی وزارتوں کے تجربے کے بعد پیش کی گئی، جنہوں نے مسلمانوں کو یقین دلا دیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ان کی حیثیت مستقل اقلیت کی سی رہ جائے گی۔ اس جواب میں قرارداد کے بنیادی نکات کو اصل متن کی روشنی میں واضح کیا جائے گا اور ساتھ ہی وہ ابہام اور اس کی بعد ازاں وضاحت بھی بیان ہو گی جو قرارداد کے متن میں موجود تھی۔

پس منظر: مطالبہ کیوں ناگزیر ہوا

1928 کی نہرو رپورٹ نے جداگانہ انتخابات ختم کر کے اور مضبوط مرکز کی تجویز دے کر مسلمانوں کے تمام بڑے مطالبے رد کر دیے، جس کے جواب میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات پیش کیے، مگر کانگریس انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ 1930 میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد ریاست کا تصور پیش کر دیا تھا۔ پھر 1937 کے انتخابات کے بعد بننے والی کانگریسی وزارتوں کے ڈھائی سالہ دور میں مسلمانوں کو اسکولوں میں بندے ماترم، ودھیا مندر اسکیم، ہندی کی جبری ترویج اور مقامی سطح پر امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا، جس پر مسلم لیگ نے پیر پور رپورٹ اور شریف رپورٹ جیسی دستاویزات بھی شائع کیں۔ ان تجربات نے عام مسلمان کو یقین دلا دیا کہ مسئلہ چند شکایات کا نہیں بلکہ نظام کی ساخت کا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر 1939 میں کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور مسلم لیگ نے یومِ نجات منایا، لیکن برطانوی حکومت کے ساتھ بھی یہ سوال کھڑا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کا آئینی مستقبل کیا ہو گا۔ اسی پس منظر میں لاہور اجلاس طلب کیا گیا تاکہ مسلمان اپنے آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کر سکیں۔ قائداعظم نے اجلاس کے صدارتی خطبے میں دو قومی نظریے کی فلسفیانہ وضاحت کی اور کہا کہ اسلام اور ہندو مت سماجی نظام کے طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان دو قوموں کو ایک ہی ریاست میں جکڑنا عدم اطمینان اور بالآخر تباہی کا باعث بنے گا۔ اس تقریر نے قرارداد کے لیے فکری فضا تیار کی اور قرارداد کے نکات اسی فکر کا عملی اظہار بنے۔

قرارداد کے بنیادی نکات

قرارداد کا پہلا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو گا جو اس اصول پر مبنی نہ ہو کہ جغرافیائی طور پر متصل اکائیاں (units) اس طرح علاقوں (regions) میں تقسیم کی جائیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں علاقائی ازسرِنو ترتیب کے ساتھ وہ علاقے بنائے جائیں جن میں مسلمان عددی اکثریت میں ہوں، خصوصاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی خطے۔ اس نکتے نے دو باتیں طے کر دیں: ایک یہ کہ مسلمان علاقے جغرافیائی تسلسل رکھیں گے، دوسرے یہ کہ حد بندی کے وقت تہذیبی و انتظامی سہولت کے لیے معمولی ردوبدل ممکن ہو گا۔ یہی بنیاد بعد میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم اور سرحدی کمیشنوں کی بحث میں کام آئی۔

دوسرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ یہ علاقے ملا کر آزاد ریاستیں تشکیل دیں جن کی جزوی اکائیاں (constituent units) خود مختار اور خود مختیار اختیارات (autonomous and sovereign) کی حامل ہوں۔ تیسرا نکتہ اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق تھا: قرارداد نے واضح کیا کہ ان علاقوں اور اکائیوں میں اقلیتوں کو مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور انتظامی حقوق کے مناسب، مؤثر اور لازم تحفظات آئین میں فراہم کیے جائیں گے اور اسی طرح ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں بھی ان کے حقوق کا اسی طرح تحفظ کیا جائے گا، اور یہ تمام تحفظات اقلیتوں سے مشاورت کے ساتھ طے پائیں گے۔ چوتھا نکتہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا خاکہ تیار کرے جس میں دفاع، خارجہ امور، مواصلات اور محصولات وغیرہ جیسے اختیارات متعلقہ علاقوں کو منتقل ہوں گے۔

ان نکات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قرارداد نے نہ صرف ریاست کا مطالبہ کیا بلکہ اس کا فریم بھی دیا: خود مختار اکائیوں پر مشتمل آزاد ریاست، اقلیتوں کے تحفظ کی آئینی ضمانت اور موضوعات کی تقسیم میں علاقوں کی بالادستی۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ قرارداد میں باقاعدہ لفظ پاکستان استعمال نہیں ہوا تھا؛ یہ نام صحافت اور عوامی زبان نے

اسے دیا، اور ہندو پریس نے اسے قراردادِ پاکستان کہہ کر شائع کیا تو یہی نام مستقل ہو گیا۔ اسی طرح قرارداد میں مرکزی حکومت یا متحدہ وفاق کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ مجوزہ ریاستیں مکمل خود مختاری کی حامل تصور کی جاتی تھیں۔

لفظ ریاستوں کی وضاحت اور 1946 کا فیصلہ

قرارداد کے انگریزی متن میں لفظ States (ریاستیں) جمع میں استعمال ہوا تھا، جس سے یہ ابہام پیدا ہوا کہ شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں دو الگ آزاد ریاستیں مقصود ہیں یا ایک ہی ریاست۔ بعض حلقوں نے اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا کہ مسلم لیگ بنگال اور پنجاب وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی فیڈریشن چاہتی ہے۔ اس ابہام کا عملی حل اپریل 1946 میں دہلی میں ہونے والے مسلم لیگ کے منتخب نمائندوں کے کنونشن میں ہوا، جس میں قرارداد منظور کر کے واضح کر دیا گیا کہ شمال مغربی اور مشرقی دونوں خطے ملا کر ایک ہی آزاد اور خود مختار پاکستان کی تشکیل کریں گے اور کسی دوسری تجویز پر سمجھوتا نہیں کیا جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد مطالبہ پاکستان غیر مبہم ہو گیا اور 1945-46 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے اسی بنیاد پر مسلمانوں کی بھاری اکثریت حاصل کی، جس نے ثابت کر دیا کہ یہ مطالبہ محض قیادت کا نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی خواہش ہے۔ تین جون 1947 کے منصوبے میں بالآخر یہی بنیاد تسلیم کر لی گئی۔ یوں قرارداد کے نکات کی تفہیم کرتے وقت اس کے اصل متن کے ساتھ 1946 کی اس تشریح کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ تاریخ میں اسی مشترکہ شکل نے عملی روپ اختیار کیا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرارداد نے مذاکرات کا دروازہ مکمل بند نہیں کیا تھا؛ 1946 میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو جزوی طور پر قبول بھی کیا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیادت کے لیے عزیز ترین چیز آزاد پاکستان کا مقصد تھا اور بات چیت کو وہ اسی حد تک قبول کرتی تھی جہاں یہ مقصد مجروح نہ ہو۔

قرارداد کی اہمیت

قراردادِ پاکستان کی اہمیت اس کے نکات کے ساتھ اس کے سیاسی اثرات میں بھی ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کو ایک واضح منزل دی؛ اس کے بعد گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں تحریکِ پاکستان عوامی تحریک بن گئی اور آزادی کے صرف سات سال کے اندر پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ قرارداد کے یومِ منظوری، 23 مارچ، کو آج پاکستان میں قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ دن ہے جب مسلمانوں نے اپنے مستقبل کا اجتماعی فیصلہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں قرارداد نے دو قومی نظریے کو دستاویزی شکل دی اور اس کے

اقلیتوں کے تحفظ والے نکتے نے ظاہر کیا کہ مطالبہ کسی مذہبی تعصب پر نہیں بلکہ آئینی انصاف پر مبنی تھا، چنانچہ پاکستان بننے کے بعد بھی یہی نکتہ قراردادِ مقاصد 1949 اور بعد کے آئینوں میں اقلیتوں کے حقوق کی بنیاد بنا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قراردادِ پاکستان کے بنیادی نکات چار تھے: مسلمان اکثریتی علاقوں کی جغرافیائی تنظیمِ نو سے آزاد ریاستوں کی تشکیل، ان کی اکائیوں کی خود مختاری اور خود مختار حیثیت، اقلیتوں کے حقوق کی مؤثر آئینی ضمانت اور مجلسِ عاملہ کو متعلقہ اختیارات کی منتقلی سمیت آئین سازی کا اختیار۔ یہ نکات بیسویں صدی کے برصغیر کے سب سے اہم سیاسی دستاویزات میں سے قرار پائے، کیونکہ انہوں نے ایک منتشر اقلیت کو ایک قوم اور ایک مبہم خواہش کو واضح ریاستی مطالبے میں بدل دیا۔ 1946 کی دہلی تشریح نے واحد پاکستان کی صورت واضح کی اور یوں یہ قرارداد قیامِ پاکستان کی نظریاتی اور سیاسی بنیاد بن گئی، جس کی یاد آج بھی تحریکِ آزادی کی تاریخ کا سب سے درخشاں باب ہے۔

سوال نمبر 4: مسلم لیگ کے قیام کے محرکات (20 نمبر)

سوال نمبر 4: مسلم لیگ کے معرضِ وجود میں آنے کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے؟ بحث کریں۔ (20)

تعارف

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں عمل میں آیا، جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ کی تجویز پر مسلمانوں کی ایک مستقل سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ ہوا۔ سر آغا خان اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور نواب محسن الملک کو سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ لیگ کا قیام کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے پچھلے پچاس برس کے سیاسی، تعلیمی، معاشی اور سماجی تجربات کھڑے تھے۔ 1857 کے بعد مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم، تعلیم میں پسماندہ اور حکومتی دباؤ کا شکار تھے، جبکہ کانگریس جیسی تنظیمیں موجود ہونے کے باوجود مسلمانوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے مخصوص مسائل کی نمائندگی کا کوئی باقاعدہ سیاسی پلیٹ فارم موجود نہیں۔

اس سوال کا تقاضا ہے کہ ان محرکات کی نشاندہی کی جائے جنہوں نے مسلمان رہنماؤں کو سیاسی تنظیم کی ضرورت پر آمادہ کیا۔ ان محرکات میں 1857 کے بعد کی زبوں حالی، سرسید احمد خان کی فکری رہنمائی، ہندی اردو تنازعہ، کانگریس کے کردار سے مایوسی، بنگال کی تقسیم پر ہندو ردِ عمل اور شملہ وفد کی کامیابی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ بحث کے دوران یہ بھی واضح ہو گا کہ مسلم لیگ کا قیام کسی فرقہ وارانہ دشمنی کی پیداوار نہیں تھا بلکہ ایک اقلیت کی جانب سے اپنے آئینی حقوق کے تحفظ کی منظم کوشش تھی، جیسا کہ لیگ کے ابتدائی مقاصد، یعنی حکومت سے وفاداری، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ اور فروغ اور دیگر اقوام سے خیر سگالی کے تعلقات، سے ظاہر ہوتا ہے۔

1857 کے بعد کی زبوں حالی اور سیاسی خلا

1857 کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے خلاف انتقامی پالیسی اپنائی؛ جاگیریں ضبط ہوئیں، نوکریاں بند ہوئیں اور دہلی کے مسلمان معاشی و سماجی طور پر تباہ ہوئے۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے انگریزی تعلیم جلد اختیار کر لی اور انتظامیہ میں جگہ بنانے لگے۔ پچاس برس تک مسلمانوں کے پاس نہ کوئی سیاسی آواز تھی نہ کوئی تنظیم، جبکہ ہندو آبادی کے پاس پہلے سے ہی سیاسی انجمنیں اور پھر انڈین نیشنل کانگریس موجود تھی۔ یہ خلا خود بخود بنیادی محرک تھا: مسلمان رہنماؤں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ آئندہ آئینی اصلاحات میں حصہ صرف انہی کو ملے گا جو منظم سیاسی دباؤ رکھتے ہوں گے، لہٰذا سیاسی تنظیم کے بغیر مسلمان ہر مرحلے پر اپنے حقوق سے محروم رہیں گے۔

اس زبوں حالی کا دوسرا پہلو معاشی اور تعلیمی تھا۔ مسلمان زمین داری اور روایتی دست کاریوں سے جڑے تھے، جدید تجارت اور صنعتی تنظیم میں ان کی شمولیت کم تھی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کی شرح ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں کم تھی۔ جس قوم کے پاس نہ دولت ہو نہ تعلیم نہ نوکری، اس کے لیے سیاسی نمائندگی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہی احساس 1906 سے چند ماہ پہلے کے سیاسی ماحول میں تیزی سے عام ہوا، اور اخبارات اور کانفرنسوں میں مسلمانوں کی ایک مستقل سیاسی جماعت کا مطالبہ بار بار سامنے آنے لگا۔ ڈھاکہ کا اجلاس اسی جمع شدہ شعور کا نتیجہ تھا، اس لیے لیگ کو محض چند نوابوں کی جماعت سمجھنا درست نہیں؛ اس کی جڑیں اس عوامی بے چینی میں تھیں جو پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل چکی تھی۔

سرسید کی فکری رہنمائی اور ہندی اردو تنازعہ

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو یہ سیاسی سبق دیا تھا کہ وہ کانگریس سے الگ رہیں، انگریز حکومت سے تصادم کے بجائے تعلیم اور وفاداری کے راستے سے اپنی جگہ بنائیں اور اپنے مفادات کی نمائندگی خود کریں۔ 1867 میں بنارس کے ہندی اردو تنازعے نے سرسید کی آنکھیں کھول دیں: جب اردو کو سرکاری دفاتر سے نکلوانے کی تحریک چلی تو انہیں کہنا پڑا کہ اب ہندو اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے ایک دل ہو کر نہیں چل سکتے، کیونکہ زبان جیسے مشترکہ تہذیبی ورثے پر بھی اکثریت سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ واقعہ دو قومی شعور کے ابتدائی اظہاروں میں سے ہے اور بعد کے قائدین کی سوچ پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

سرسید کی وفات کے بعد ان کی فکر کو نواب محسن الملک اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے آگے بڑھایا۔ اردو دفاع ایسوسی ایشن کے تجربے نے یہ بھی سکھایا کہ خالص تعلیمی پلیٹ فارم سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کافی نہیں؛ احتجاج اور نمائندگی کے لیے سیاسی تنظیم ناگزیر ہے۔ ادھر علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل نوجوانوں کی ایک نسل تیار ہو چکی تھی جو جدید سیاست کی زبان سمجھتی تھی۔ ان سب عوامل نے ڈھاکہ کے فیصلے کے لیے فکری زمین تیار کی۔ درحقیقت مسلم لیگ کی گڑھ تحریک کا سیاسی تسلسل کہا جا سکتا ہے: علی گڑھ نے مسلمان کو تعلیم اور خود اعتمادی دی اور لیگ نے اس خود اعتمادی کو سیاسی تنظیم کی شکل عطا کی۔

کانگریس کا کردار اور اکثریتی جمہوریت کے خدشات

انڈین نیشنل کانگریس 1885 میں قائم ہوئی اور ابتدا میں اس میں چند مسلمان بھی شامل تھے، لیکن آہستہ آہستہ اس کا رنگ اکثریتی ہو گیا؛ اس کی قیادت، مطالبات اور علامات مسلمانوں کو غیر مانوس لگنے لگیں۔ کانگریس خود کو پوری قوم کی نمائندہ کہتی تھی مگر مسلمانوں کے مخصوص مطالبات، خصوصاً جداگانہ نمائندگی اور ملازمتوں میں حصے، پر اس کا رویہ عموماً سرد مہری کا تھا۔ 1905 کے بعد کانگریس میں شدت پسند (extremist) رجحان ابھرا، تلک جیسے رہنماؤں کی سیاست مذہبی علامات سے جڑی اور سودیشی تحریک نے مسلمان تاجروں اور رعایا کو بھی متاثر کیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر برطانوی حکومت کانگریس کے دباؤ میں آ کر نمائندہ ادارے قائم کرتی ہے تو ووٹ کی تعداد کی بنیاد پر مسلمان مستقل اقلیت میں چلے جائیں گے۔

یہ خدشہ محض مفروضہ نہیں تھا؛ اس دور کی آئینی بحث کا مرکز ہی یہ تھا کہ ہندوستان میں مغربی طرز کی اکثریتی جمہوریت اقلیت کے تحفظ کے بغیر نافذ ہو تو وہ عملاً مستقل اکثریتی حکومت بن جاتی ہے۔ اسی لیے نواب محسن الملک اور دیگر رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے معاملات خود اپنی تنظیم کے ذریعے پیش کرنے ہوں گے، ورنہ کانگریس ان کے نام پر بھی بولے گی اور ان کے خلاف بھی۔ یہ بنیادی سوچ لیگ کے قیام کا سب سے مضبوط سیاسی محرک تھی اور بعد کی پوری آئینی جدوجہد، جداگانہ انتخابات سے لے کر قراردادِ پاکستان تک، اسی سوچ کا تسلسل رہی۔

بنگال کی تقسیم، شملہ وفد اور فوری مواقع

اکتوبر 1905 میں لارڈ کرزن نے انتظامی سہولت کے نام پر بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کیا۔ اس سے مشرقی بنگال و آسام کا نیا صوبہ بنا جس میں مسلمان اکثریت میں تھے اور ڈھاکہ اس کا دارالحکومت بنا۔ مسلمانوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا کیونکہ انہیں تعلیم، ملازمت اور ترقی کے نئے دروازے کھلنے کی امید تھی، لیکن کانگریس اور ہندو پریس نے اس کے خلاف سخت ملک گیر تحریک چلا دی اور مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ان کے فائدے کی ہر انتظامی تجویز بھی اکثریتی دباؤ کے نیچے دب جائے گی۔ یہ تجربہ سیاسی تنظیم کی ضرورت کا زندہ ثبوت بن گیا؛ اگر مسلمان منظم ہوتے تو ان کا مؤقف بھی اتنی ہی قوت سے سنا جاتا۔

اسی پس منظر میں یکم اکتوبر 1906 کو سر آغا خان کی قیادت میں پینتیس رکنی مسلمان وفد نے شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات اور آبادی کے تناسب سے زیادہ وزن (weightage) کا مطالبہ پیش کیا۔ وائسرائے نے وفد کو یقین دلایا کہ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کو ان کی تاریخی حیثیت کی روشنی میں تسلیم کیا جائے گا۔ اس کامیابی سے رہنماؤں پر واضح ہو گیا کہ مؤثر نتائج کے لیے مستقل تنظیم درکار ہے جو ایسے مطالبات کو مسلسل آگے بڑھائے۔ چنانچہ دسمبر 1906 میں ڈھاکہ میں لیگ کا قیام اسی سال کے واقعات کا منطقی انجام تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ انگریز حکام مسلمانوں کی سیاسی تنظیم سازی سے ناخوش نہیں تھے، لیکن یہ کہنا کہ لیگ انگریزوں کی تخلیق تھی، تاریخی سچائی کے خلاف ہے؛ اصل محرک مسلمانوں کے اپنے جمع شدہ تجربات اور خدشات تھے، حکومتی سرپرستی ثانوی عامل تھی۔

نتیجہ

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کے قیام کے محرکات کئی سطحوں پر کام کر رہے تھے: 1857 کے بعد کی سیاسی و معاشی زبوں حالی نے سیاسی خلا پیدا کیا، سر سید احمد خان کی فکر اور ہندی اردو تنازعے نے جداسیاسی شعور دیا، کانگریس کے اکثریتی رنگ اور جمہوریت کے خدشات نے الگ پلیٹ فارم کی ضرورت کو شدت دی، بنگال کی تقسیم پر ردِ عمل نے اس ضرورت کو عملی صورت دی اور شملہ وفد کی کامیابی نے منظم سیاسی کی افادیت ثابت کر دی۔ ڈھاکہ 1906 میں بننے والی یہ جماعت اگلے چالیس برس میں برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ آواز بنی اور اسی کی قیادت میں پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔ اس لیے مسلم لیگ کے محرکات کو سمجھنا دراصل پوری تحریکِ پاکستان کی بنیادوں کو سمجھنا ہے۔

سوال نمبر 5: صوفی کی تعریف اور تبلیغ اسلام میں صوفیائے کرام کی خدمات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: صوفی کسے کہتے ہیں؟ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں صوفیائے کرام کی خدمات کا تفصیلاً جائزہ لیں۔ (20)

تعارف

برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ صوفیائے کرام کے کردار، محبت اور خدمت کے ذریعے پھیلا۔ فوجی فتوحات سے علاقے ضرور اسلامی حکومتوں کے زیرِ اثر آئے مگر دلوں کی فتح خانقاہوں سے ہوئی، جہاں سے ہر مذہب، ہر ذات اور ہر طبقے کے انسان کو بلا امتیاز محبت اور عزت ملی۔ داتا گنج بخش لاہور، خواجہ معین الدین چشتی اجمیر، بابا فرید الدین گنج شکر پاکپتن، بہاؤالدین زکریا ملتانی، مخدوم جہانیاں، نظام الدین اولیا دہلی اور لال شہباز قلندر سیہون جیسے بزرگوں نے اس خطے کی تہذیب کو ایسی گہری جھلک دی کہ آج بھی ان کے مزارات عقیدت کے مراکز ہیں اور اردو، پنجابی، سندھی اور پشتو ادب ان کے فیض سے سرشار ہے۔

اس سوال کے دو حصے ہیں: پہلے صوفی کی تعریف اور لفظِ صوفی کی مختلف توجیہات بیان ہوں گی اور تصوف کے بنیادی اصول واضح کیے جائیں گے، پھر تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں صوفیا کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا، جس میں خانقاہی نظام، لنگر و سماجی مساوات، مقامی زبانوں کا استعمال، کردار کی تبلیغ اور مختلف سلاسل کی خدمات شامل ہوں گی۔ یہ

جائزہ اس لیے بھی اہم ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں اسلام کی اشاعت کا یہ پرامن پہلو اکثر سیاسی تاریخ کے شور میں چھپ جاتا ہے، حالانکہ آبادی کی بڑی سطح پر اسلام قبول کرنے کا اصل ذریعہ یہی صوفیانہ تبلیغ تھی۔

صوفی کسے کہتے ہیں؟

لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں کئی آراء ہیں۔ ایک رائے کے مطابق یہ صوف یعنی اون سے نکلا ہے، کیونکہ ابتدائی زاہد و عابد سادہ اونی لباس پہنتے تھے جو دنیا سے بے رغبتی کی علامت تھا۔ دوسری رائے اسے صفا یعنی پاکیزگی سے منسوب کرتی ہے کہ صوفی وہ ہے جس کا دل دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو۔ تیسری رائے اس کا تعلق اہلِ صفہ سے جوڑتی ہے، مسجد نبوی کے وہ فقرا صحابہ جو علم و عبادت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ بعض محققین اسے صفِ اول سے بھی جوڑتے ہیں، یعنی اللہ کے نزدیک صفِ اول کے لوگ۔ ان توجیہات میں اون والی نسبت زیادہ مشہور ہے، لیکن اہلِ تصوف کے نزدیک اصل اہمیت نام کی نہیں باطن کی اصلاح کی ہے۔

اصطلاحی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ صوفی وہ مسلمان ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اپنے باطن کی اصلاح، تزکیہ نفس اور تربیتِ قلب کے حصول میں زندگی صرف کرے، مخلوق سے محبت کرے اور خود کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دے۔ داتا گنج بخش نے اپنی مشہور کتاب کشف المحجوب میں تصوف کو اخلاقِ حسنہ کا نام دیا اور فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو خود سے فانی اور حق کے ساتھ باقی رہے۔ تصوف کے بنیادی ارکان میں توبہ، زہد، صبر، شکر، توکل، رضا، محبت اور ذکر و فکر شامل ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حقیقی تصوف شریعت سے الگ کوئی راستہ نہیں؛ صوفیائے کرام نماز، روزے اور احکامِ شرع کی سختی سے پابندی کرتے اور اس کے بغیر باطنی ترقی کو ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ یہی شریعت و طریقت کا امتزاج ان کی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی بنیاد تھا۔

تبلیغ کا صوفیانہ طریقہ کار اور خانقاہی نظام

صوفیا کی تبلیغ کا طریقہ تبلیغ بالحال تھا، یعنی زبان سے پہلے کردار سے دعوت۔ ان کی خانقاہیں ایسے کھلے مراکز تھیں جہاں مسافر، غریب، کسان، دست کار اور ہر مذہب کا جو یا بغیر رکاوٹ آسکتا تھا۔ خانقاہ میں کوئی ذات پات نہیں تھی، امیر و غریب ایک ساتھ بیٹھتے اور ایک دستر خوان سے کھاتے۔ یہ طرزِ عمل اس معاشرے کے لیے انقلابی تھا جہاں ذات کا

نظام انسان کو پیدائش کی بنیاد پر درجوں میں بانٹتا تھا؛ جب نچلی ذات کے انسان کو خانقاہ میں پہلی بار انسانی عزت ملی تو اس کے دل میں اسلام کے لیے قدرتی کشش پیدا ہوئی اور یہی کشش دھیرے دھیرے قبولِ اسلام کی راہ ہموار کرتی گئی۔

خانقاہ کے ساتھ لنگر اس نظام کی روح تھا۔ بابا فرید کے لنگر اور بعد میں سکھ مذہب پر بھی اس روایت کے اثرات جیسے ادارے اس بات کی دلیل ہیں کہ بھوکے کو کھانا، پیاسے کو پانی اور مسافر کو سائبہ دینے کو صوفیا نے عبادت سمجھا۔ خواجہ معین الدین چشتی کا مشہور قول ہے کہ اللہ کی محبت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ محتاج کی مدد کی جائے، سوار کو گراتے ہوئے سہارا دیا جائے اور بھوکے کو کھلایا جائے۔ اسی عملی مساوات اور خدمت نے برصغیر کے کروڑوں لوگوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کیا، اور یہ عمل صدیوں پر محیط اور بتدریج تھا، جس میں کسی جبر کے بجائے اخلاقی اثر نمایاں رہا۔ خانقاہیں ساتھ ساتھ علم کے مراکز بھی تھیں جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم، سلوک کی تربیت اور ادب کی روایت پروان چڑھتی رہی۔

عظیم صوفیائے کرام کی خدمات

برصغیر کے صوفیائے کرام کی خدمات کا نقشہ بہت وسیع ہے۔ گیارہویں صدی میں داتا علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش خراسان سے لاہور آئے؛ ان کی کتاب کشف المحجوب فارسی میں تصوف کی اولین مستند کتابوں میں سے ہے اور لاہور کو انہوں نے علم و عرفان کا ایسا مرکز بنایا کہ بعد کے بزرگ یہاں سے فیض لے کر آگے بڑھے، خواجہ معین الدین چشتی بھی اجمیر جانے سے قبل لاہور میں ان کے مزار پر حاضر ہوئے تھے۔ بارہویں صدی کے آخر میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیر شریف پہنچے اور راجپوتانہ کے قلب میں اسلام کی پرامن اشاعت کی بنیاد رکھی؛ ان کے خلفاء میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی دہلی اور بابا فرید پاکپتن نے اس سلسلے کو پورے شمالی ہند میں پھیلا دیا۔

بابا فرید سے تربیت پانے والے حضرت نظام الدین اولیا دہلی کو محبوبِ الٰہی کہا جاتا ہے؛ ان کی خانقاہ سلاطین سے لے کر عام مزدور تک سب کے لیے کھلی تھی اور ان کے مرید امیر خسرو جیسی ہستیاں بھی تھیں جنہوں نے برصغیر کی موسیقی و ادب پر دائمی اثرات چھوڑے۔ ملتان میں حضرت بہاؤالدین زکریا اور ان کے پوتے شاہ رکن عالم نے سہروردی سلسلے کے ذریعے سندھ و پنجاب میں اسلام پھیلایا اور خانقاہ کو سماجی خدمت کا مرکز بنایا۔ سندھ میں لال شہباز قلندر نے سیہون کو رواداری اور محبت کا گہوارہ بنایا جہاں آج بھی ہر

مذہب کے لوگ حاضری دیتے ہیں۔ بنگال، دکن، کشمیر اور گجرات میں بھی شاہ جلال، بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ عالم جیسے بزرگوں نے اسی پر امن طریقے سے اسلام کی روشنی دور دور تک پہنچائی۔

جدول 1: برصغیر کے اہم صوفی سلاسل اور ان کے نمایاں بزرگ

سلسلہ	نمایاں بزرگ	اہم مرکز	خصوصی خدمات
چشتیہ	خواجہ معین الدین چشتی، بابا فرید، نظام الدین اولیاء	اجمیر، پاکپتن، دہلی	خدمتِ خلق، لنگر، سماع و مقامی زبان میں تبلیغ
سہروردیہ	بہاؤالدین زکریا، شاہ رکن عالم	ملتان، اچ شریف	خانقاہی نظام کی تنظیم، علم و سماجی خدمت
قادریہ	میاں میر، شاہ عبدالحق دہلوی	لاہور، دہلی	تعلیم و حدیث کی اشاعت، اصلاحِ باطن
نقشبندیہ	خواجہ باقی باللہ، مجدد الف ثانی	دہلی، سرہند	شریعت کی پابندی، اصلاحِ حکمرانان و عقائد

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

مقامی زبانیں، ادب اور سماجی اصلاح

صوفیا کی تبلیغ کی ایک نمایاں خصوصیت مقامی زبانوں کا استعمال تھا۔ انہوں نے تبلیغ کے لیے عوام کی بولی کو ذریعہ بنایا، چنانچہ ان کی شاعری اور ملفوظات نے پنجابی، سندھی، سرائیکی، پشتو، کشمیری، دکنی اردو اور بنگالی زبانوں کو اسلامی فکر کا خزانہ عطا کیا۔ بابا فرید کے شلوک پنجابی ادب کی بنیادوں میں گنے جاتے ہیں اور یہ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں بھی شامل ہیں، جو ان کی بین المذاہب قبولیت کا ثبوت ہے۔ شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ، خواجہ غلام فرید، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور رحمان بابا جیسے صوفی شعرا نے وحدت، محبت، خودی کی نفی اور سماجی انصاف کے پیغام کو عام آدمی کی زبان میں گھر گھر پہنچایا۔

سماجی سطح پر صوفیا نے ذات پات، اونچ نیچ اور دولت کی تفریق کو عملاً رد کیا، عورت کی عزت، غلاموں سے نرمی اور محنت کش کی قدر جیسی اقدار کو رواج دیا اور رسومِ جاہلانہ کے خلاف خاموش مگر مؤثر جدوجہد کی۔ ان کے ہاں ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی مکالمہ ہوتا تھا؛ یوگ کے تصورات اور مقامی روحانی روایات سے گفتگو نے اسلام کو اس خطے

کی فضا میں بے گانہ نہیں رہنے دیا۔ مزید یہ کہ صوفیا سیاست کے شور سے عموماً دور رہے اور جب حکمرانوں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانی پڑی تو اٹھائی بھی؛ خلق کو حکمرانوں کے دربار سے دور رکھنے اور خود بھی محلاتی آسائشوں سے الگ رہنے نے ان کی اخلاقی ساکھ کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کی بات سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ صوفی وہ اہلِ دل ہے جو شریعت کی پاسداری کے ساتھ تزکیۂ نفس، محبتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ برصغیر میں صوفیائے کرام کی خدمات محض روحانی نہیں بلکہ تہذیبی، ادبی اور سماجی بھی ہیں: انہوں نے خانقاہ و لنگر کے نظام سے مساوات اور بھائی چارے کی عملی مثال قائم کی، مقامی زبانوں میں تبلیغ کر کے اسلام کو عوامی سطح تک پہنچایا، اور اپنے کردار کی روشنی سے لاکھوں دلوں کو ایمان سے آشنا کیا۔ آج برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کی اسلامی وابستگی دراصل انہی بزرگوں کے فیض کا ثمر ہے۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ یہاں اسلام کا اصل مبلغ دربار یا تلوار نہیں بلکہ خانقاہ تھی، اور صوفیائے کرام اس خطے کی تاریخ کے سب سے بڑے سماجی مصلحین میں شمار ہوتے ہیں۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com